© rasailojaraid.com

نقد و نظر

کائنات کی تخلیق اور ارتقا کی بحث جس قدر پرانی ہے اسی قدر دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ اگرچہ اس کائنات کا آغاز حرفِ "کُن" سے ہوا لیکن "کُن" کی صدا اب بھی دمادم آرہی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے جس کی جنبش سے ہر لحظہ نئے جہان پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ "تخلیق و ارتقا" کی اس قسط میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم و مغفور نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کائنات کی تخلیق شعور یا شعورِ مطلق کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ کائنات کی تخلیق کا یہ عمل ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شعور کی فطری خواہش اور اس کا خودکارانہ یا آزادانہ داعیۂ خود نمائی ہے۔ بادی النظر میں مادہ ایک الگ شے دکھائی دیتا ہے اور حیات ایک الگ شے لیکن ع "لہو خورشید کا ٹپکے اگر قطرے کا دل چیریں" کے مصداق دونوں کی حقیقت ایک ہے یعنی دونوں جگہ شعور ہی کی نیرنگ سازیاں ہیں۔ جس طرح حیات میں ایک عمل موجود ہے اسی طرح مادہ کے اندر بھی تحریک عمل موجود ہے اور اس کا مشاہدہ ہماری آنکھوں کو ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیا کی ہر شے زندہ ہے کیونکہ زندگی کی علامت عمل ہی تو ہے۔ فرق صرف مدارج کا ہے یعنی یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیوان کی زندگی مادّہ کی زندگی سے اولیٰ ہے اور انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے ارفع ہے۔ مدارج کا یہ فرق شعور کی کمی بیشی سے پیدا ہوا ہے اور شعور جو انسان سے ادنیٰ تر زندگی کی صورتوں میں مقیّد و محبوس ہوتا ہے، انسانی شکل میں آکر یکلخت آزاد ہوجاتا ہے۔ آزادی کی دولت سے متصف ہونے کے بعد شعور خود بین ہوجاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے اندر قوانینِ طبیعی اور مادّہ کی مزاحمتوں پر قابو پاکر آگے بڑھنے اور نئے جہان تعمیر کرنے کی امنگ پیدا ہوجاتی ہے اور "تو شب آفریدی چراغ آفریدم" کے مصداق زندگی کی پیش قدمی جاری رہتی ہے اور بتقاضائے ارتقائے شعور یہ پیش قدمی تا ابد جاری رہے گی۔

اس شمارے کا دوسرا مضمون برِصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے ارتقاء کے بارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہے۔ محمد طفیل صاحب نے پاکستان کے نظامِ تعلیم کی خرابیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم کسی طرح بھی تسلّی بخش نہیں، یہ نہ تو ہمارے ماضی کا امین ہے نہ اس میں حال کی ضروریات کا اہتمام پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہ ہماری مستقبل کی امیدوں اور امنگوں کا ضامن ہو سکتا ہے۔ آخر میں مصنّف نے ایسے مقاصد کی ایک فہرست مرتب کی ہے جن کی روشنی میں نصابِ تعلیم کو ترتیب دیا جائے تو اس کے مفید اور قابلِ عمل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

وحدت الوجود کے نظریے نے برِّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے زہرِ ہلاہل کا کام کیا۔ عباداللہ فاروقی صاحب نے "ہندوستان میں نظریۂ وحدت الوجود کا سیاسی پس منظر" میں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ نظریہ ہندو یونان کی سیاست کا شاخسانہ ہے اور اس نظریے کو عام کرنے کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر سے ان کی انفرادیت و قومیت کے شعور کو ناپید کر دیا جائے تاکہ وہ اپنا جداگانہ قومی و ملّی تشخص برقرار رکھنے کے اہل نہ رہیں۔

پروفیسر خالد علوی صاحب نے اپنے "نظریۂ پاکستان" میں بڑی خوبصورتی سے ان مقاصد اور اسباب کی نشاندہی کی ہے جو قیامِ پاکستان کا موجب بنے۔ اس نظریے کی صراحت اس لیے ضروری ہے کہ نئی نسل کو، جو تحریکِ پاکستان سے نابلد ہے، یہ بتایا جائے کہ ہمارے بزرگوں نے الگ مادرِ وطن کے لیے جو قربانیاں دیں آخر ان کا مقصد کیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے پاکستان کے بانی حضرت قائدِ اعظم اور تحریکِ پاکستان کے مقتدر رہنماؤں کے خیالات کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ پاکستان کا قیام نہ ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے معاشی استحصال کا نتیجہ ہے اور نہ ہی محض ہندو طرزِ عمل کا نتیجہ۔ یہ دونوں اسباب کسی حد تک معاون اور ذیلی حیثیت سے ضرور کارفرما رہے ہیں لیکن قیامِ پاکستان کا اصلی محرک ہمارے ملّی و تہذیبی تشخص کا تحفظ تھا اور اپنی انفرادیت کے اس تحفظ کے لیے مسلمانوں نے علیحدہ خطّے کا مطالبہ کیا تھا۔

"خودی اور آخرت" کی تیسری قسط میں جناب مظفر حسین صاحب نے خودی اور آخرت کے بارے میں علّامہ اقبال کے نظریات کو بڑی صراحت اور عالمانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے علّامہ کے خیالات کی سند قرآن و احادیث سے لے کر یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ دراصل خودی کے استحکام ہی سے زندگی کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ آئندہ زندگی میں جنت و دوزخ کی جزا و سزا کا تمام تر انحصار عمل پر ہے اور عمل میں خیر و شر کا معیار یہ ہے کہ جو عمل خودی کو استحکام بخشے وہ خیر ہے اور جنت ہے اور جو عمل خودی کو ضعیف اور منتشر کرنے کی کوشش کرے وہ شر ہے اور دوزخ ہے۔

© rasailojaraid.com